تعارف

اسرار احمد

(شائع شدہ "میثاق" بابت مئی ۱۹۶۹ء)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۲ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقیدِ حیات ہی تھے پروفیسر صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانح حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لیے اوّلاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لیے خود لکھی تھی اور ثانیاً 'پیغامِ اقبال' کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر 'مثنوی اسرار و رموز' کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا ——— پروفیسر صاحب کی اَن گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آ گئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی۔ اور اس طرح اب قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہے۔

اس تحریر کا اصل حصّہ جو علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے ملّتِ اسلامی کو دیا ہے وہ تو آئندہ شائع ہوگا۔ اس ماہ حیات و سیرت اقبالؒ کا اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصّل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور

© rasailojaraid.com

ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علاّمہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی اور انشاء اللہ قارئین 'میثاق' میں سے وہ حضرات بھی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جو علاّمہ مرحوم کے حالات زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ خود علاّمہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکّرین پر جو نوٹ ضمناً اس مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیّت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصّۂ ماضی بن چکیں۔ چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے —— اس میں بھی ایک خزانہ عبرت پنہاں ہے ع

"جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ"!

★★

بقیہ: حرفِ اوّل

بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے جو اپنے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور چونکہ یہ مضمون 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' نامی کتابچے کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے، لہٰذا 'دعوت رجوع الی القرآن' کے اُس کام سے بھی اس کی خصوصی نسبت بنتی ہے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے پیش نظر ہے۔

★

com

حیات و سیرتِ اقبال

ایک اجمالی خاکہ

علامۃ العصر ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہ، کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے جن کی گوت "سپرو" تھی۔ وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوتے تھے اور اس ولی کا روحانی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسن عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسی لیے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلاً:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوتے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا۔ ؎۱ میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہوگا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحب اقبال ہوگا۔ اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوتے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ

؎۱ حاشیے کے لیے صا۵۱ ملاحظہ فرمائیے، قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام حواشی مضامین کے اختتام پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

سے میٹرک پاس کر کے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب[2] کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیضِ صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النّادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علّامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معروف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرنلڈ[3] کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدۃ العمر باقی رہا۔ آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ "جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسّر آ جائے، وہ رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے۔"

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے[4]۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔ دورانِ قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علما اور فضلا کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ[۵]، ڈاکٹر براؤن[۶]، ڈاکٹر نکلسن[۷] اور ڈاکٹر سارلے[۸] خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ پہلے انار کلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام[۹] ہے۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے۔ جو مجنوں کو کوئے لیلیٰ سے تھی۔

۱۹۳۳ء میں جاوید منزل ———— ۱۹۳۸ء میں وفات

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج، صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرزِ زندگی رکھتا ہو، جو VISIONARY IDEALIST ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملتِ اسلامیہ کی بہبود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنّف ہو اسے "نظائرِ دیوانی" اور "امثلۂ فوجداری" سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۳ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لیے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا

© rasailojaraid.com

میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر، ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہو گا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ استاد بہرحال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہو گا۔ بہرکیف آپ نے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کر لیجیئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیجیں۔

تلمذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ" اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی"۔ اقبال کی خوش نصیبی کہ اُسے داغ جیسا زبان دان اور کامل الفن استاد ملا۔ اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے"۔

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں، داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

om

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں — مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے :-

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض — ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کرلی جو اُن کے لیے مناسب تھی۔ یعنی ۱۹۱۱ئ سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہوگئی۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ئ کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے "خونِ شہداء کی نذر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کردی۔ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہُو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے ہر آئندہ نظم سوز درونی کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علّامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ اس لیے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضیکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں (PLAIN LIVING

© rasailojaraid.com

AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا درِ فیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہوجاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوان علم وفضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاگنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملّتِ اسلامیہ کی بہبود کی تدبیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ع

شہرت شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشق مصطفٰےؐ سے مالامال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حُبّ رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف درد آشنا دل درکار ہے[11]۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ

کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبّت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

علامہؒ کی تصنیفات

(۱)	علم الاقتصاد	اُردو	نایاب ہے۔
۲۔	فلسفۂ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
۳۔	اسرارِ خودی	فارسی	〃 〃 〃
۴۔	رموزِ بے خودی	〃	〃 〃 〃
۵۔	پیامِ مشرق	〃	〃 〃 〃
۶۔	زبورِ عجم	〃	〃 〃 〃
۷۔	لکچرز مدراس	انگریزی	〃 〃 〃
۸۔	جاوید نامہ	فارسی	〃 〃 〃
۹۔	بانگِ درا	اُردو	〃 〃 〃
۱۰۔	بالِ جبریل	〃	〃 〃 〃
۱۱۔	ضربِ کلیم	〃	〃 〃 〃
۱۲۔	مسافر	فارسی	〃 〃 〃
۱۳۔	"پس چہ باید کرد"	〃	〃 〃 〃
۱۴۔	ارمغانِ حجاز	فارسی و اُردو	〃 〃 〃

قدردانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر اُن کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال

© rasailojaraid.com

AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا درِفیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو باآسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوان علم وفضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاگنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملتِ اسلامیہ کی بہبود کی تدبیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ع

شہرت شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشق مصطفےؐ سے مالامال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حُبّ رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف درد آشنا دل درکار ہے۔[11]

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک متفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ

com
om